REVIEW OF RESEARCH
ISSN: 2249-894X
IMPACT FACTOR : 5.7631(UIF)
VOLUME - 12 | ISSUE - 11 | AUGUST - 2023

معاصر اردو افسانے میں کہانی کی واپسی

از:۔ڈاکٹر انجم فاطمہ

کہانی سننا اور کہانی کہنا، انسان کی فطرت کا جز ہے۔عہد حاضر کا افسانہ حکایت، داستان، اور ناول سے آگے کی دنیا کو ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ابتدائی دور کے افسانے اصلاح پسندی، عشق و رومان، حب الوطنی اور آزادی کی تڑپ کے ترجمان نظر آتے ہیں۔1932ء میں ''انگارے'' کی اشاعت سے افسانے کی دنیا میں ہلچل پیدا ہوئی۔پریم چند نے 1936ء میں افسانہ ''کفن'' لکھا تو اردو افسانہ نگاروں کو فکری اور فنی سطح کو متاثر کیا اور اس کے ارتقاء کو آگے بڑھایا۔اردو افسانے کی تاریخ کوئی بہت زیادہ پرانی نہیں ہے۔اس لئے اس کو آسانی سے مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ ابتداء یعنی 1900ء سے 1936ء، فن کار: (سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، راشد الخیری، پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی)۔

2۔ 1936ء سے (ترقی پسند تحریک) سے 1960ء (جدیدیت)

3۔ 1960ء سے جدیدیت) سے 1980ء (مابعد جدیدیت)

4۔ 1980ء (مابعد جدید) سے تاحال۔

1936ء سے 1955ء کے عہد کو ترقی پسند تحریک کے تحت افسانے کا زرین دور سمجھا جاتا ہے۔اس عہد میں راجندر سنگھ بیدی، (لاجونتی) (اپنے دکھ مجھے دے دو) سعادت حسین منٹو (ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹھنڈا گوشت) کرشن چندر، عصمت چغتائی، غلام عباس، بلونت سنگھ، سہل عظیم آبادی، پنڈت سدرشن، حکیم احمد شجاع، علی عباس حسینی، اعظم کریلوی، حیات اللہ انصاری، عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی اور اختر انصاری وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ترقی پسند تحریک کے افسانہ نگاروں پر روشنی ڈالتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''ان افسانہ نگاروں کے یہاں موضوعات میں بھی تنوع ہے اور فکر میں بھی، اسلوب میں بھی نیرنگی ہے۔اور تکنیک میں بھی''

(۱)

1947ء میں ملک کی تقسیم عمل میں آئی۔اس زمانے میں سماجی و سیاسی ڈھانچہ بدل گیا۔اب فنکار کے سامنے مسائل کا ڈھیر تھا، اب سماجی اور سیاسی ڈھانچہ کچھ اس نوع کا تھا کہ فنکار کو استعارہ، تشبیہ، تجرید، تخیل، علامت، تمثیل جیسے فنی لوازمات سے کام لینا مجبوری بھی تھی اور تقاضہ وقت بھی، نئے افسانہ نگاروں کے اس رویہ کو بعض ناقدین نے ''روایت سے انحراف'' کا نام دیا اور بعض نے اسے باغیانہ لے کہا بعض نے اسے شناخت کا مسئلہ بھی قرار دیا۔پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بروقت اس بحران کو محسوس کرتے ہوئے چند سوالات قائم کئے ہیں لکھتے ہیں:

''نیا افسانہ دراصل اس وقت ایک ایسے آئینے کے روبرو ہے جو شکستوں سے چور ہے نئی کہانی نے نہایت بے رحمی سے فرسودہ

ڈھانچہ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔لیکن کیا نئی کہانی جس حد تک وہ نئی ہے۔کہانی نہیں ہے؟ یا جس حد تک وہ کہانی ہے' وہ نئی نہیں ہے۔کیا کہانی کا کہانی پن فرسودہ ڈھانچے کا ایسا عنصر ہے جس کا لازم ہے؟ کہانی خواہ وہ کتنی ہی انامّ تجریدی' استعاراتی' تمثیلی' علامتی یا فنطاسیائی ہو' کیا کہانی پن کے بغیر اس کی تشخیص ممکن ہے؟ نیز یہ کہ نئی کہانی کی جمالیاتی حدود کیا ہیں ۔۔۔۔نئی کہانی زماں و مکاں کے منطقی رشتوں کو لاشعوری طور پر بدل دینے پر قادر تو ہی لیکن زمین و آسماں کی وسعتوں میں اسے کہیں تو پیر لٹکانے ہی پڑتے ہیں اور کسی نہ کسی لمحے میں تو سانس لینی ہی پڑتی ہے؟ کہانی کتنی ہی آفاقی اور باطنی ہو' کیا واضح یا پوشیدہ طور پر وہ ہمیشہ سماج اور معاشرے سے جڑی نہیں رہتی''(2)

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے یہاں اس امر پر زور دیا ہے کہ افسانہ چاہے کسی تکنیک کے سہارے لکھا جائے' کسی موضوع پر' اس میں کہانی اہم ہوتی ہے اور ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے۔

1955ء سے 1975ء یا 1980ء تک اردو افسانے میں کئی تجربات کئے گئے ان گنت تجربات ہوئے اور انہی تجربات میں کہانی کہیں کھوسی گئی تھی۔انہی تجربات کی وجہ سے اردو افسانے کو جو نقصان اٹھانا پڑا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیگ احساس لکھتے ہیں:

''ادب آسمان سے نازل نہیں ہوتا زمین سے پھوٹتا ہے۔گو مضامین غائب سے آتے ہیں لیکن ادب اپنے ماحول سے نمو پاتا ہے۔جدید افسانے کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس نے روایت کا احترام نہیں کیا بلکہ اچھی روایتوں سے انحراف کیا اور خلاء میں جھولنے لگا' زمین پر پیر ٹکائے بغیر آسمان کو چھونے کی کوشش کرنے لگا۔زبان' اسلوب اور تکنیک کو معنی اور موضوع پر ترجیح دی گئی۔پلاٹ کو بالکل مسترد کر دیا گیا۔مشاہدے اور ادراک کی مسخ شدہ تصویریں پیش کی جانے لگیں۔غیر مربوط' غیر منطقی بیانیہ استعمال کیا گیا۔ترقی پسند افسانے نے اپنے پیش رو افسانے سے بہت کچھ لیا تھا۔ترقی پسند افسانے میں سماجی حقیقت نگاری اور رومانیت کے بیشتر عناصر موجود تھے یہ اور بات ہے کہ وہ بعد میں جذباتی رومانیت کھوکھلی نعرہ بازی' سیاسی تبلیغ و تلقین یا اکہری حقیقت نگاری جیسی کمزوریوں کا شکار ہو گیا۔نئے افسانے نے ترقی پسند یا حلقہ ارباب ذوق کے افسانوں سے کچھ نہیں لیا۔نتیجے میں اس افسانے نے بے حد ٹھوکریں کھائیں کبھی داستان کی طرف دیکھا تو کبھی شاعری کی طرف' کبھی تمثیل اور علامتوں کی طرف۔(3)

یہ دور دراصل جدیدیت کا دور کہلاتا ہے جدیدیت میں جو افسانے وجود میں آئے وہ ترقی پسند افسانے سے بالکل مختلف تھے۔اس دور کے افسانوں میں زماں و مکاں کا تصور باقی نہ رہا' کردار کا وجود ختم ہو گیا' مکالمے نئے انداز میں لکھے جانے لگے' تشبیہات اور استعارات کی نئے نئے لفظیات سامنے آئے' تجریدی' تمثیلی اور علامتی کہانیوں کا رواج عام ہونے لگا۔تجربات کا ایک ایسا طوفان اٹھا کہ اس طوفان میں کہانی پوری طرح بہہ گئی۔ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اپنی تصنیف'' جدیدیت اور اردو افسانہ'' میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' جدیدیت نے اردو ادب کو جہاں چند خوبصورت افسانے دیے۔۔۔جہاں شاعرانہ زبان دی۔۔۔جہاں نئے نئے موضوعات سے روشناس کروایا' جہاں نت نئے تجربات کئے وہیں جدیدیت کی شدت پسندی نے اردو افسانے کو کافی نقصان

پہنچایا لچر پچرا فسانوں کا طویل سلسلہ دیا، کردار نگاری معدوم ہوئی، پلاٹ کے تصور کی دیوار گری' حقیقت نگاری کو صداقت نگاری کے نام پر بدنام کیا گیا۔ ابہام' گنجلک علامتیں' مشکل استعارے' سخت تمثیلیں تحفے میں ملیں۔ قاری اور قلم کار کے رشتے کے بیچ گہری کھائی پیدا ہوگئی۔ اردو افسانہ اس رجحان کے زیر اثر زمین سے اکھڑ گیا''(4)

لیکن 1980ء کا دور اردو افسانے میں ایک نیا موڑ لیکر سامنے آیا۔ اور اسی دور کو مابعد جدید بھی کہتے ہیں۔ اس دور میں نہ صرف کہانی کی واپسی ہوئی بلکہ بیانیہ بھی لوٹ آیا۔ مابعد جدید میں جو تبدیلیاں آئی۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر بیگ احساس لکھتے ہیں:

''مابعد جدیدیت کسی کے خلاف ردِعمل نہیں ہے۔ افسانے میں یہ تبدیلی بتدریج آئی ہے۔ یہ کسی نقاد کی رہنمایانہ اصولوں سے نہیں آئی بلکہ خود فنکار نے اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ اس تبدیلی کی بڑی وجہ تیزی سے بدلتا ہوا منظر نامہ ہے۔ جدید ٹکنالوجی افسانے پر بھی اثر انداز ہوئی۔ فوٹو گرافی کی تکنیک کا استعمال کیا جانے لگا۔ ایک منظر کے بعد دوسرا منظر۔ پہلے منظر کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے''(5)

اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور فکشن کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں کئی افسانہ نگاروں نے نمایاں رول ادا کیا۔ جس میں قرۃ العین حیدر (پت جھڑ کی آواز' جلا وطن' شیشے کا گھر' روشنی کی رفتار' نظارے درمیاں ہے' ہاؤسنگ سوسائٹی)، سلام بن رزاق (اندیشہ' شہر گریہ' استغراق)، محمد اشرف (آدمی' ڈار سے بچھڑے' لکڑ بگھا سریز) شوکت حیات (سورج مکھی' گنبد کے کبوتر' کوا) غضنفر (تانا بانا' سانڈ' سرسوتی انسان) مشتاق احمد نوری (لمبے قد والا بونا' تلاش' بند آنکھوں کا سفر) سہیل وحید (پرستیش برف کی' لچی پونی) مشرف عالم ذوقی (صدی کو الوداع کہتے ہوئے، باپ بیٹا، دادا اور پوتا، سمتوں کا جواب) ساجد رشید (ریت گھڑی' پناہ' دوپہر' سونے کے دانت' راکھ' ایک چھوٹا سا جہنم' احمد صغیر (انا کو آنے دو' روشنی بلاتی ہے' کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی' منڈیر پر بیٹھا پرندہ' سفر ابھی ختم نہیں ہوا' کرفیو کب ٹوٹے گا) ترنم ریاض (آہنگ' مٹی' ماں' باپ' دھندلے آئینے' گندے نالے کے کنارے' تنکے' کمرشل ایریا)، عبدالصمد (گومڑ' ہونی انہونی' بن موسم برسات' نجات) جیلانی بانو (گل نغمہ' موت کے بیچ' راستہ بند ہے' کاش' اکیلا سمندر' بھاگو بھاگو) اقبال مجید (پوشاک' آخری پتہ' ہائی وے پر ایک درخت' پیٹ کا کچوا' چیلیں)، نورالحسنین (چیخ' ایک زندہ کہانی' افق پر گرفت، سمٹتے دائرے)، عارف خورشید (ٹوٹا ہوا آئینہ)' بیگ احساس (لقمہ' ہنزل) حمید سہروردی (کہانی در کہانی' عقب کا دروازہ) وغیرہ شامل ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کی افسانوں کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر بیگ احساس لکھتے ہیں:

''مابعد جدید افسانے میں قاری کی شمولیت اور قاری سے راست مخاطبت کے پہلو پر بھی زور دیا گیا۔ پریم چند کے ''سوا سیر گیہوں'' کرشن چندر کے ''کالو بھنگی'' سے اسد محمود خاں کے ''وقائع نویس'' تک مثالیں پیش کی گئیں۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ پرانے لکھنے والوں میں اور نئے لکھنے والوں میں کیا فرق ہے۔ مشکل یہی ہے کہ جب کسی وصف کا اظہار کیا جاتا ہے تو اس کا بے جا استعمال بھی کیا جاتا ہے بعض افسانہ نگار قاری سے مخاطب ہو کر افسانے میں الجھاؤ پیدا کر رہے ہیں۔ افسانہ نگار یہ بتاتا ہے کہ ایک مخصوص جانور کا نام کتنی بار استعمال کیا ہے۔ اب وہ اسے آخری بار استعمال کر رہا ہے۔ وہ استعارے کا استعمال

نہیں کر رہا ہے کیونکہ وہ استعارے کو ایک خاص جنگلی جانور سمجھتا ہے وغیرہ۔ راوی کی یہ مداخلت فنکارانہ چابکدستی سے نہ کی جائے تو پھر بے حد گراں گذرتی ہے''(6)

مابعد جدید دراصل حقیقت نگاری کا دور ہے فنکار جو کچھ دیکھتا یا سوچتا ہے اسے الفاظ کا جامعہ پہنا کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جدیدیت میں فنکار اور قاری کا رشتہ ٹوٹ سا گیا تھا جبکہ مابعد جدید کے فنکاروں نے ایک بار پھر کہانیوں میں قاری کو اپنے ساتھ لیکر آگے بڑھنے کی کوشش کیں۔ مابعد جدید کے فنکاروں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جو وہ ہر روز ان سے دو چار ہوتے ہیں گوپی چند نارنگ کہانی کی واپسی اور موضوعات کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترقی پسند اور جدیدیت کے مابعد مابعد جدیدیت کا زمانہ ہے جو نئی ثقافتی صورت حال بھی ہے اور جس کی اپنی ادبی پہچان بھی ہے۔ ان کا کہنا ہے (۱) افسانہ میں بیانیہ کی بحالی ہوئی ہے (۲) کہانی پن استرا دنظریاتی طور پر قابل قبول نہیں (۳) افسانہ قاری سے جڑ رہا ہے (۴) اجنبیت، بیگانگی، تنہائی، شکست ذات کے دیے ہوئے فارمولے پوری طرح رد ہو گئے ہیں (۵) کوئی نظریاتی فارمولا قابل قبول نہیں (۶) بین المتونیت (۷) تانیثیت (۸) پوسٹ کولونیل سیاسی سماجی مسائل (۹) دلت، ذات، پات، اقلیت کے مسائل (۱۰) معنیاتی نظام (۱۱) فن کی تکثیریت (۱۲) تہذیبی جڑوں، مفامیت پر اصرار یہ سب آج کی نئی پہچان ہیں''(7)

آج کا افسانہ اپنے پیروں پر پوری طرح کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ افسانے میں کہانی براہِ راست شروع ہوئی ہے اور اپنے انجام کو پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی شروع سے لیکر آخر تک برقرار رہتی ہے۔ قاری بنا کسی جنگل میں بھٹکے ہوئے آسانی سے اپنی آخری منزل طے کر لیتا ہے۔ مابعد جدید افسانے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مختصر یہ کہ پہلے جو چیز ہم سے دور ہو گئی تھی یا کسی طرح کھو گئی تھی وہ ایک بار پھر مابعد جدیدیت میں واپس آ گئی ہے وہ بھی ایک ترقی یافتہ شکل کی صورت میں۔۔۔ آخر میں' میں (انجم فاطمہ) اپنی بات پروفیسر بیگ احساس کے اقتباس پر ختم کرتی ہوں:

''آج کا افسانہ نگار تفہیم سے زیادہ تاثر پر زور دیتا ہے۔ آج کا افسانہ تجربہ کی بھٹی سے تپ کر نکل چکا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ کندن بن گیا ہے لیکن اس کی تشکیل کا عمل مکمل ہو چکا ہے۔ افسانہ زیادہ واضح ہو گیا ہے یہ تاثر بھی چھوڑ رہا ہے اور جو تاثر بنتا ہے وہ قابل بیان بھی ہے۔ واقعات کی کڑی جوڑنے سے کہانی کی صورت بنتی ہے یہ ماضی کی طرف مراجعت نہیں بلکہ کہانی بازیافت اور مستقبل کی طرف جست ہے۔ یہ افسانہ عصری مسائل سے جڑا ہوا ہے اس کے موضوعات اس دور سے متعلق ہیں یہ افسانہ اپنے پیشرو افسانے سے اپنی علاحدہ شناخت بنا رہا ہے''(۸)

حوالے

۱) گوپی چند نارنگ' ارتضیٰ کریم' اسلم جمشید پوری' آزادی کے بعد اردو افسانہ (جلد اول) 2003ء

۲) ایضاً

۳) پروفیسر بیگ احساس ''شور جہاں تنقیدی مضامین'' ص 172، 2005ء
۴) ڈاکٹر اسلم جمشید پوری ''جدیدیت اور اردو افسانہ'' ص 96، 2001ء
۵) ترتیب گوپی چند نارنگ' ارتضی کریم' اسلم جمشید پوری' آزادی کے بعد اردو افسانہ جلد اول، 2003ء
۶) ایضاً صفحہ 180، 181
۷) ترتیب گوپی چند نارنگ' ارتضی کریم' اسلم جمشید پوری' آزادی کے بعد اردو افسانہ
جلد اول، 2003ء
۸) پروفیسر بیگ احساس' شور جہاں' تنقیدی مضامین'' ص 157، 2005ء

☆☆☆

Dr Anjum Fatima
Asst,Prof,Dept of Urdu
,S.S.A's Arts and Commerce College Solapur